تأویل کی ضرورت اور شرائط و حدود

ڈاکٹر حبیب اللہ چشتی ☆

تأویل کا لفظ باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کا سہ حرفی مادہ "أول" ہے جس میں لوٹنے، پھر جانے اور کسی چیز کا انتظام کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ " آل الیہ" کے معنی ہیں: وہ اس کی طرف لوٹا اور "آلَ الشّئَ" کے معنی ہیں: اس نے اس چیز کو لوٹا دیا۔ " آل الرعیة" کا مطلب ہے: اس نے رعایا کا انتظام کیا۔ امام راغب اصفہانیؒ اس لفظ کا لغوی مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الأول. أی الرجوع إلی الأصل ومنه الموئِل للموضع الذی یرجع إلیه و ذلک هو ردّ الشیّ الی الغایة...... الأول السیاسة "(۱)۔

("الأول" سے مراد ہے اصل کی طرف لوٹنا۔ اسی سے " موئل" ہے جو ایسی جگہ کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کے لوٹنے کی جگہ ہوتی ہے اور وہ کسی چیز کا اپنے مقصد کی طرف لوٹنا ہے...... الاوّل کا ایک معنی کسی چیز پر حکمرانی کرنا بھی ہے)۔

امام زرکشیؒ تاویل کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أصله من المآل وهو العاقبة و المصیر و قد اوّلته فآل أی صرفته فانصرف فکأن التأویل صرف الآیة الی ما تحتمله من المعانی. وقیل اصله من الایالة وهی السیاسة فکأن المؤوّل للکلام یؤوی الکلام و یضع المعنٰی فیه موضعه" (۲)۔

(تاویل کی اصل "مآل" ہے۔ جس سے مراد کسی چیز کی عاقبت اور اس کا انجام ہے۔ "أوّلته فآل" کا معنی ہے: میں نے کسی چیز کو پھیرا پس وہ پھر گئی۔ گویا تاویل سے مراد یہ ہے کہ جس آیت میں بہت سے معانی کا احتمال ہو، ان میں سے کسی ایک معنی کی طرف اس آیت کو پھیر دینا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تأویل کی اصل "الایالة" ہے۔ جو حکمرانی کرنے کو کہا جاتا ہے گویا کسی کلام کی تاویل کرنے والا کلام پر حکمرانی کرتا ہے اور کسی معنی کو اس کے مقام پر رکھ دیتا ہے)۔

ڈاکٹر محمد حسین ذہبیؒ "تأویل" کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"التأویل ماخوذ من الأول وهو الرجوع قال فی القاموس آل إلیه أوْلا ومآ لا: رجع...... وقیل التأوبل مأخوذ من الایالة وهی السیاسة فکأن المؤول یسوس

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، ایف۔جی بوائز پوسٹ گریجویٹ کالج، H-8، اسلام آباد۔

الکلام و یضعه فی موضعه" (۳)۔

(تأویل کا لفظ الأول سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا ہے۔ قاموس میں ہے آل الیه أولاد و مآلا کا معنی ہے وہ لوٹا...... یہ بھی کہا گیا ہے کہ تاویل کا لفظ ایالہ سے مشتق ہے جس کا معنی حکمرانی کرنا ہے گویا تأویل کرنے والا کلام پر حکمرانی کرتا ہے اور اسے اس کی جگہ پر منطبق کر دیتا ہے)۔

اس سے واضح ہوا کہ تاویل کا لفظی معنی رجوع کرنا، لوٹنا یا کسی چیز پر حکمرانی کرنا ہے۔

لفظ تاویل اور قرآن مجید

تاویل کا اصطلاحی مفہوم واضح کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں لفظ تاویل کے استعمال کی متعدد صورتیں جان لی جائیں۔ تا کہ اس لفظ کی وسعت مزید عیاں ہو جائے۔

قرآن مجید میں تاویل کا لفظ متعدد مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن دقتِ نظر سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر جگہ کسی نہ کسی پہلو سے رجوع کرنے کا یہ مفہوم پایا جاتا ہے اور یہی تاویل کا لغوی معنی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مندرجہ ذیل معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۱۔ خواب کی تعبیر

سورہ یوسف میں تاویل کا لفظ آٹھ مقامات پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد خواب کی تعبیر ہے۔ ایک جگہ پر ارشاد ہے:

﴿قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۴)۔

(انہوں نے فرمایا: اے میرے باپ میں نے اس سے پہلے جو خواب دیکھا تھا یہ اس کی تعبیر ہے)۔

جب بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو درباریوں نے کہا:

﴿وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ﴾ (۵)۔ (اور ہمیں ایسے خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں ہے)۔

اس سورہ میں ان کے علاوہ بھی چھ مقامات پر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ انجام

کبھی یہ لفظ کسی چیز کی عاقبت اور اس کے انجام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾ (۷)۔

(پس اگر کسی معاملہ میں تمہارا تنازعہ ہو جائے تو اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو تو اس معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ یہی صورت بہت بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (۸)۔

(اور جب ناپ تول کرو تو پورا ناپا کرو اور صحیح ترازو سے تولا کرو یہ بہت بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے)۔

ان آیات میں یہ لفظ عاقبت اور انجام کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

۳۔ اخبارِ انبیاء کرام علیہم السلام

کبھی یہ لفظ کسی ایسی پیشین گوئی کے واقع ہونے کے لیے آتا ہے جس کی خبر کسی نبی علیہ السلام نے دی ہو۔ اللہ تعالیٰ منکرین کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (۹)۔

(اور کیا یہ لوگ اس چیز کے منتظر ہیں کہ وہ خبر پوری ہو جائے۔ جس دن وہ خبر ظاہر ہو جائے گی۔ اس دن وہ لوگ جو پہلے اسے فراموش کر چکے تھے کہیں گے بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق لے کر آئے تھے)۔

سورۃ یونس میں بھی یہ لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے (۱۰)۔

۴۔ کسی کام کا موجب یا اس کی حقیقت

کبھی یہ لفظ کسی کام کے موجب و محرک کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے یعنی اس کام کو کرنے کا سبب کیا تھا اور اس کی حقیقت کیا تھی۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ (۱۱)۔

(اب میں آپ کو اس چیز کی حقیقت بتاؤں گا جس پر آپ صبر نہیں کر سکے)۔

اور پھر — کشتی مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم

کی وضاحت کرنے کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ (۱۲)۔

(یہ ہے اس کی حقیقت جس پر آپ صبر نہیں کر سکے)۔

۵۔ **تشریح و توضیح**

تاویل کا لفظ قرآن مجید میں کسی چیز کی تفسیر یا اس کی توضیح کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں بعض آیات محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور بعض آیات متشابہ ہیں اور پھر فرمایا:

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾(۱۳)۔

(اور جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنہ کی تلاش میں اور ان کی تعیین جاننے کی تلاش میں متشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں)۔

تاویل کے ان متعدد معانی میں لوٹنے اور رجوع کرنے کا مفہوم کسی نہ کسی حد تک ہر جگہ موجود ہے جیسے تعبیر کی صورت میں خواب کہاں لوٹ رہا ہے اور حقیقت کی صورت میں معاملہ کہاں لوٹ رہا ہے۔

تاویل کا اصطلاحی مفہوم

تاویل کے اصطلاحی مفہوم میں متقدمین اور متاخرین کی آراء مختلف ہیں:

متقدمین کے ایک قول کے مطابق تاویل سے مراد کسی کلام کا معنی اور اس کی تشریح ہے اس لحاظ سے یہ لفظ تفسیر کا مترادف ہے۔ امام طبری کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت بار بار یہ الفاظ لکھتے ہیں: "القول فی تاویل قوله تعالی کذا و کذا" کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر یوں ہے۔ مجاہد کہتے ہیں: "ان العلماء یعلمون تاویله"۔

ایک قول یہ ہے کہ تاویلِ کلام سے مراد کلام کا مقصود اور مفہوم ہے چنانچہ اگر کلام کسی طلب پر مشتمل ہو تو جو چیز مطلوب ہے وہی اس کی تاویل ہے اور اگر کلام کسی خبر پر مشتمل ہے تو جو خبر دی جا رہی ہے وہی اس کی تاویل ہے(۱۴)۔

ایک قول یہ ہے: "التفسیر یتعلق بالروایة و التأویل یتعلق بالدرایة" (۱۵)۔

(تفسیر کا تعلق روایت سے ہے اور تاویل کا درایت سے)۔

ایک قول یہ ہے کہ تفسیر کا لفظ الفاظ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور تاویل کا معانی کے لیے۔ مثلاً البصیرہ کی تشریح تفسیر کہلائے گی اور خواب کی تعبیر کو تاویل کہا جائے گا جبکہ ایک دوسرے قول کے مطابق تاویل کا لفظ صرف کتب مقدسہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ تفسیر کتب مقدسہ اور دیگر کتب سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک ترتیب عبارت سے جو مفہوم مستفاد ہو وہ تفسیر کہلاتا ہے اور عبارت سے جو مفہوم اشارتاً معلوم

ہوتاویل کہلاتا ہے(۱۶)۔

متأخرین کے نزدیک تاویل کا اصطلاحی معنی

متقدمین نے تاویل کا جومفہوم بیان کیا تھا اس کا زیادہ تر انحصار لفظی بحث پر مبنی تھا اور وہ عقلاً یا نقلاً قرآن مجید کی توضیح وتشریح پر ہی مشتمل تھا لیکن تاویل کے جس مفہوم نے اسے ایک معرکتہ الآراء مسئلہ بنا دیا اور جس کی آڑ میں قرآن کریم سے ایسے مفاہیم مستنبط کیے گئے جن کا اسلام اور قرآن سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ بقول اقبالؒ

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پازند

تاویل کے جس مفہوم کو بنیاد بنا کر گمراہ فرقوں نے اپنے خود ساختہ نظریات کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی، وہ تاویل کا وہی مفہوم ہے جو متاخرین فقہا اور متکلمین کے نزدیک تھا۔ ان کے نزدیک تاویل کا اصطلاحی معنی ہے:

"صرف اللفظ عن المعنی الراجح الی المعنی المرجوع لدلیل یقترن به"(۱۷)۔
(کسی دلیل کی وجہ سے کسی لفظ کے راجح معنی کو چھوڑ کر اس کے مرجوح معنی مراد لینا)۔
مثلاً "لا دین لمن لا عهدله" (۱۸)۔(جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں)۔

یہاں لَا دِیۡنَ کا تقاضا تو یہ تھا کہ بدعہد کو کافر سمجھا جائے لیکن قرآن وسنت کے دیگر دلائل وشواہد کی روشنی میں یہ بات طے شدہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں بلکہ فاسق ہے اس لیے یہاں پر لَا کا راجح اور عمومی معنی چھوڑ کر مرجوح معنی مراد لیا کہ بدعہد کا دین مکمل نہیں ہے یا اس کا دین بہت کمزور ہے یہاں تک کہ گویا اس کا کوئی دین نہیں ہے۔ اس عمل کو متاخرین کے نزدیک تاویل کہا جاتا ہے۔

تاویل کی ضرورت و اہمیت

قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے بعض مقامات پر کسی لفظ کے راجح معنی کو چھوڑ کر مرجوح معنی مراد لینا یا تاویل سے کام لینا اس قدر ضروری ہے کہ کوئی حقیقت پسند آدمی اس کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے تاویل ہونی ہی نہیں چاہیے کیونکہ قرآن مجید خود کتاب مفصل ہے اور عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ تو اس کی یہ بات ایک صحیح بات سے غلط نتیجہ نکالنے کی ایک مثال ہوگی کیونکہ تاویل کا تصور ہر زبان میں پایا جاتا ہے اور یہ کتاب مفصل یا عربی مبین ہونے کے منافی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں متعدد ایسے مقامات ہیں جن کا راجح معنی مراد ہو ہی نہیں سکتا اور وہاں تاویل کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾(۱۹)۔
(اور جو اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا)۔

یہاں جو اعمیٰ کا لفظ آیا ہے اس کا راجح معنی ہے۔ اندھا یا نابینا یعنی وہ شخص جو بینائی سے محروم ہو۔ تو آیت کا راجح معنی تو یہاں بنتا ہے کہ جو شخص دنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا میں اندھا ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور تو نہیں ہے تو اسے آخرت میں بھی اندھا کیوں رکھا جائے گا اس لیے یہاں پر اس لفظ میں تاویل سے کام لیا اور اس کا راجح معنی چھوڑ کر مرجوع معنی مراد لیا کہ یہاں دنیا میں اندھا ہونے سے مراد بصارت سے محروم شخص نہیں ہے بلکہ بصیرت سے محروم شخص ہے یعنی جو شخص یہاں خداداد بصیرت سے کام لے کر راہِ حق کو نہیں دیکھے گا اسے سزا کے طور پر آخرت میں اندھا کر کے اٹھایا جائے گا۔

قرآن مجید کا ایک دوسرا مقام اس تاویل کی صداقت کو واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰىO قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا﴾(۲۰)۔

(اور جس نے میری یاد سے منہ موڑا تو اس کے لیے تنگ زندگی ہے اور ہم قیامت کے دن اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے مجھے نابینا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا)۔

اس مقام پر بغیر تاویل کے آیت کی تفسیر ممکن ہی نہیں ہوگی اس لیے علامہ ابن کثیر یہاں اعمی کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أی عن حجة اللّٰه و آیاته و بیناته "(۲۱)۔(یعنی جو اللہ کی دلیل، اس کی نشانیوں اور بینات سے اندھا ہوگیا)۔

ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ یا کسی اور عضو کی نسبت کی گئی ہے تو وہاں بھی اس کا راجح معنی مراد نہیں ہوسکتا۔ یہاں قیامت کے وقوع کو ماضی کے صیغوں سے بیان کیا گیا ہے وہاں بھی ماضی کا صیغہ مستقبل کے معنی میں ہوگا یا تحقیق کے معنی میں ہوگا بہرحال وہاں بھی راجح معنی ترک کر کے مرجوع معنی ہی مراد لیا جائے گا۔ یعنی اس میں تاویل کی جائے گی۔

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ تفسیر قرآن میں تاویل کی ضرورت و اہمیت کا کوئی حقیقت پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا۔

تاویل کی حدود و قیود اور شرائط

تاویل کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ اور اس کی افادیت بھی مسلم، لیکن اگر تاویل کا یہی مفہوم ہو تو پھر جس کے دل میں جو آئے گا وہ کہتا رہے گا اور دین بازیچہ اطفال بن جائے گا۔ اس لیے علماء و مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ تاویل شتر بے مہار کی طرح نہیں ہوتی بلکہ اگر چند شرائط و قیود پائی جائیں گی تو وہ تأویل صحیح کہلائے گی ورنہ تاویل فاسد اور گمراہی والا دینیت کے زمرہ میں آئے گی۔

تاویل کی شرائط قیود سمجھنے کے لیے پہلے تاویل کی مفصل تعریف پر غور کرنا ہوگا جو علماء و مفسرین نے کی ہے۔

تاویل کا جامع و مانع مفہوم

چونکہ کسی لفظ کا حقیقی اور راجح معنی مراد لینا ہی اصل چیز ہے۔ راجح معنی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جاتا جب تک کوئی قوی دلیل ایسا کرنے کا تقاضا نہ کرے۔ جیسا کہ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"ان اللفظ إذا كان له معنى راجح ثم دلّ دليل اقوى منه على ان ذلك الظاهر غير مراد، علمنا ان مراد الله تعالىٰ بعض مجازات تلك الحقيقة" (٢٢)۔

(جب لفظ کا ایک راجح معنی ہو پھر کوئی اس سے بھی قوی دلیل اس پر دلالت کرے کہ یہاں ظاہری معنی مراد نہیں ہے تو ہم جان جائیں گے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی مراد اس حقیقی معنی کی کوئی مجازی صورت ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ تاویل کی جو جامع و مانع تعریفات مفسرین کرام اور علمائے دین نے کی ہیں ان سے تاویل کی بہت سی حدود و قیود اور شرائط معلوم ہو جاتی ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں

"التاويل صرف الاية الى معنى موافق لما قبلها و ما بعدها تحتمله الآية، غير مخالف للكتاب والسنة من طريق الاستنباط" (٢٤)۔

(استنباط کرتے ہوئے ایک آیت کو ایسے معنی کی طرف پھیرنا جو سیاق کلام کے مطابق ہو، آیت اس کا احتمال بھی رکھتی ہو اور وہ معنی کتاب و سنت کے مخالف بھی نہ ہو، تاویل کہلاتا ہے)۔

امام زرکشیؒ نے بھی ابو القاسم بن حبیب نیشاپوری بغدادی اور کواشی کے حوالہ سے تاویل کی یہی تعریف کی ہے (٢٥)۔

سید شریف جرجانیؒ نے تأویل کی جامع و مانع تعریف کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"التأويل في الاصل الترجيع وفي الشرع صرف اللفظ عن معناه الظاهر الى معنى يحتمله، اذا كان المحتمل الذى يراه موافقا بالكتاب و السنة مثل قوله تعالى يخرج الحي من الميت ان اراد به اخراج الطير من البيضة كان تفسيرا، وان اراد إخراج المؤمن من الكافر و العالم من الجاهل كان تأويلا" (۲۶)۔

(تاویل کی اصل تو لوٹانا ہے اور شریعت میں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے ایسے معنی کی طرف پھیرا جائے جس کا وہ احتمال رکھتا ہو اور وہ معنی کتاب و سنت کے موافق ہونا چاہیے مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یخرج الحي من الميت کہ وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہو کہ انڈے سے پرندے کو نکالتا ہے تو یہ اس کی تفسیر کہلائے گا اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ وہ کافر سے مومن کو یا جاہل سے عالم کو پیدا کرتا ہے تو یہ معنی اس کی تاویل ہوگا)۔

ڈاکٹر محمد حسین ذہبیؒ تاویل کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"هو صرف اللفظ عن المعنى الواجح الى المعنى المرجوح لدليل يقترن به" (۲۷)۔

(تاویل سے مراد یہ ہے کہ کسی دلیل کی وجہ ایک لفظ کے راجح معنی کو چھوڑ کر اس کا مرجوح معنی مراد لیا جائے)۔

تأویل کی مندرجہ بالا تعریفات سے اس کی درج ذیل شرائط اور حدود و قیود بالکل واضح ہو جاتی ہیں اور یہی شرائط روایت و درایت کے عین مطابق بھی ہیں جن کا التزام ضروری ہے ورنہ حقیقت خرافات میں کھو جائے گی اور جس کا جو جی چاہے گا وہ تاویل کے نام سے کہتا رہے گا خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

ان تعریفات سے تاویل کی درج ذیل شروط اور حدود و قیود واضح ہو رہی ہیں:

۱۔ راجح معنی ترک کرنے پر کوئی قوی دلیل ہو۔
۲۔ جو مرجوح معنی مراد لیا جائے وہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہو۔
۳۔ وہ معنی قرآن مجید کے خلاف نہ ہو۔
۴۔ وہ تاویل یا مرجوح معنی سنت کے خلاف نہ ہو۔
۵۔ تواتر کے خلاف یا اجماع امت کے خلاف نہ ہو۔

اگر تاویل میں ان شروط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو وہ تأویل نہ صرف درست ہوگی بلکہ اسلام اور قرآن کی

خدمت سمجھی جائے گی اور اگر ان شروط کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے تو وہ تاویل فاسد ہوگی ایسا کرنے والا خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ ان شروط کی کچھ وضاحت ملاحظہ ہو۔

راجح معنی کا ترک قرینہ مانعہ کے بغیر نہ ہو

چونکہ الفاظ میں اصل ان کا راجح معنی ہوتا ہے اس لیے وہاں مرجوح معنی اس وقت تک مراد نہیں لیا جائے گا جب تک کوئی قوی دلیل راجح معنی لینے سے مانع نہ ہو۔ مثلاً چاند کا راجح معنی قمر یا ماہتاب ہے۔ اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ میں نے چاند دیکھا تو مراد یہی ہوگی کہ اس نے قمر یا ماہتاب کو دیکھا لیکن اگر ماں اپنے بیٹے کو دیکھ کر کہے میرا چاند آ گیا تو ظاہر ہے کہ یہاں چاند سے مراد اس کا بیٹا ہے کیونکہ ایک تو اس نے یہ جملہ اپنے بیٹے کو دیکھ کہا اور دوسرا میرا چاند کہنا قرینہ ہے کہ یہاں چاند کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے اور پھر ''آ گیا'' بھی اس پر قرینہ ہے کیونکہ چاند کسی کے پاس نہیں آتا۔ تو یہاں قرائن بتا رہے ہیں کہ یہاں چاند کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾(۲۸) ۔ (پھر وہ (اللہ تعالیٰ) عرش پر متمکن ہوا (جیسے اسے زیبا ہے)۔

''اِستــوٰی'' کا لغوی معنی استقام ہے یعنی وہ متمکن ہوا اب کسی مقام پر متمکن ہونا جسم کا خاصا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اس سے پاک اور مبرا ہے اس لیے اس میں تاویل کی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی تخلیق فرمانے کے بعد اس کی باگ ڈور اپنے دست قدرت میں لے لی۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ اس مقام پر فرماتے ہیں:

> ''علماء متاخرین نے اس کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اِستــوٰی'' کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھ گیا کیونکہ وہ مکان اور جلوس سے پاک ہے بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ کائنات ارضی وسماوی کی باگ ڈور اس نے اپنے دست قدرت میں تھام لی اور حکم وحکمرانی کو اپنے لیے مخصوص فرمالیا: **استوی المراد منه كمال قدرته في تدبير الملك و الملكوت**''(۲۹)۔

اسی تناظر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:

> **''دل الدليل على أنه يمتنع ان يكون الاله في المكان فعرفنا انه ليس مراد الله تعالى من هذا الآية ما اشعربه ظاهرها''**(۳۰)۔
>
> (اس پر دلیل شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی مکان میں ہونا ممتنع ہے۔ پس ہم نے جان لیا کہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں ہے جس پر اس کا ظاہر دلالت کرتا ہے)۔

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ کسی لفظ کا راجح معنی چھوڑ کر مرجوح معنی اس وقت مراد لیا جائے گا جب کوئی قوی دلیل راجح معنی مراد لینے سے مانع ہو۔ اس کے بغیر کی گئی تاویل فاسد اور گمراہی ہوگی مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾(۳۱)۔

(اور میں اللہ کے اذن سے پیدائشی اندھے اور برص کے مریض کو تندرست کر دیتا ہوں اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں)۔

اب یہاں پر الاکمه (مادر زاد اندھا) اور الابرص (کوڑھ کا مریض) کا حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"ربما اجتمع عليه خمسون الفامن المرضى من أطاق منهم أتاه ومن لم يطق أتاه عيسى عليه السلام وما كانت مدواته الا بالدعاء"(۳۲)۔

(کبھی کبھی آپ کے پاس پچاس پچاس ہزار مریض اکٹھے ہو جاتے جس میں آنے کی طاقت ہوتی وہ خود آ جاتا جو نہ آ سکتا اس کے پاس حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خود تشریف لے جاتے اور آپ (علیہ السلام) ان کا علاج صرف دعا سے فرماتے تھے)۔

چونکہ یہاں راجح معنی مراد لینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ اس لیے ان الفاظ کی تاویل کر کے کوئی مرجوح معنی مراد لینا تاویل فاسد کہلائے گا۔ جیسا کہ اس مقام پر سرسید احمد خانؒ لکھتے ہیں:

"اندھے لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے کو اور کبڑے اور ٹھگنے کو اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے، چوڑی ناک کے ہوں یا پتلی ناک کے، کبڑے ہوں یا سیدھے، ٹھگنے ہوں یا لمبے، پھلی والے ہوں یا جالے والے، سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا۔ کسی کو عبادت کے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا۔ پس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھیوں کا اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا تھا۔ جہاں جہاں بیماریوں کا انجیلوں میں اچھا کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو آیتیں ہیں ان کے بھی یہی معنی ہیں"(۳۳)۔

یہ تاویل اس لیے فاسد اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہو گی کہ یہاں راجح معنی ترک کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نزول کے وقت حضرت عیسیٰ دو زرد رنگ کی چادریں اوڑھے ہوئے ہوں گے(۳۴)۔

یہاں زرد رنگ کی چادروں سے وہی مراد ہے جو ان کا راجح معنی ہے اور سب پر واضح ہے۔ یہاں ان کی تاویل کر کے کوئی دوسرا معنی لینا تاویل فاسد اور گمراہی ہو گا۔ اس لیے اس مقام پر مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ کہنا تاویل فاسد ہو گا۔

''میں ایک دائم المرض آدمی ہوں اور دو زرد رنگ کی چادریں جن کے بارے میں حدیث میں ذکر ہے کہ ان دو چادروں میں مسیح نازل ہو گا۔ وہ دونوں میرے شامل حال ہیں۔ جن کی تعبیر علم الرؤیا کی رو سے دو بیماریاں ہیں۔ سو ایک چادر میرے اوپر کے حصہ میں ہے کہ ہمیشہ سردرد اور دورانِ سر اور کمی خواب اور تشنج دل کی بیماری دورہ کے ساتھ آتی ہے اور دوسری چادر میرے نیچے کے حصہ بدن میں ہے وہ بیماری ذیابیطس ہے کہ ایک مدت سے دامن گیر ہے اور بسا اوقات سوسو دفعہ رات کو یا دن کو پیشاب آتا ہے اور اس قدر کثرت پیشاب سے جس قدر عوارض ضعف وغیرہ ہوتے وہ سب میرے شاملِ حال رہتے ہیں''(۳۵)۔

یاد رہے کہ جمیع مذاہب باطلہ مثلاً باطنیہ، بہائیہ اور قادیانیہ وغیرہ کا سارا کاروبار تاویل فاسد پر ہی قائم ہے اور وہ لوگ تاویل کے نام پر گمراہی پھیلاتے ہیں اور سیدھے سادھے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی باطل تأویلات سے متاثر ہونے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا:

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد(۳۶)۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

"والذی نفسی بیدہ لیو شکن ان ینزل فیکم ابن مریم" (۳۷)۔

(مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تم میں ابن مریم ضرور

نازل ہوں گے)۔

اور نزول کا معنی ہے: "هو الانحطاط من علو" (۳۸)۔ یعنی حضرت عیسیٰ آسمان سے اتریں گے۔ یہ معنی بالکل واضح تھا لیکن جب مرزا صاحب نے اپنے آپ کو مسیح موعود ثابت کرنا چاہا تو کہا کہ میں تو رسول پیدا ہوا جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تو نازل ہوں گے جب کہ مرزا صاحب تو پیدا ہوئے ہیں۔ تو اس سوال کو ختم کرنے کے لیے مرزا صاحب نے جو جواب لکھا وہ تاویلِ باطل کی عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے لکھا:

"اس نزول سے مراد درحقیقت مسیح ابن مریم کا نزول نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر ایک مسیح کے آنے کی خبر دی گئی ہے جس کا مصداق حسب اعلام والہام یہی عاجز ہے" (۳۹)۔

سوال یہ ہے کہ یہاں راجح معنی ترک کرنے پر کون سی دلیل ہے؟ اور ایک ایسا معنی کیوں لیا گیا جو اس لفظ کا مرجوح معنی بھی نہیں ہے؟ اس طرح تو جو شخص جو بھی چاہے گا وہ کہتا رہے گا۔

باطنیہ کہتے تھے کہ انسان کی اپنی ذات کے سوا کوئی اس کا الٰہ نہیں ہے۔ جس پر دلیل ایک آیہ کریمہ کی تاویل فاسد کو بناتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾ (۴۰)۔ (پس انہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کیا کریں)۔

آیہ کریمہ کا مفہوم بالکل واضح تھا کہ اللہ تعالیٰ کے جس گھر کی وجہ سے قریش کو یہ مقام اور مرتبہ حاصل ہے انہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ لیکن وہ اس آیت کریمہ کا یہ مطلب بیان کرتے تھے کہ

"الرب هو الروح و البيت هو البدن" (۴۱)۔

(کہ رب سے مراد روح اور بیت سے مراد بدن ہے)۔

یہ تاویل دیگر وجوہات کے علاوہ اس لیے بھی باطل ہوگی کہ یہاں لفظ کا اصلی معنی ترک کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

تاویل کی پہلی شرط یہ ہے کہ راجح معنی اس وقت ترک کیا جائے گا جب اسے مراد لینے سے کوئی قوی قرینہ مانع ہو ورنہ وہ تاویل فاسد اور گمراہ کن ہوگی۔

مرجوح معنی بھی اسی لفظ کے معانی میں سے ہو

تاویل کی ان تعریفات سے واضح ہے کہ اس میں کسی قرینہ مانعہ کی وجہ سے راجح معنی چھوڑ کر مرجوح معنی مراد لیا جاتا ہے اس سے تاویل کی ایک اور شرط واضح ہو رہی ہے کہ تاویل میں لفظ کا وہی معنی لیا جائے گا جو اس لفظ کے معانی میں سے ایک ہو۔ یا کم از کم وہ لفظ عرفاً ہی اس معنی میں استعمال ہو۔ اگر تاویل میں کسی لفظ کا ایسا معنی مراد لے لیا جائے جس کا معنوی طور پر اس لفظ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تو ایسی تاویل باطل اور گمراہی ہوگی۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ﴾ (۴۲)۔ (اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے)۔

"نحر" کا لفظ عربی زبان میں کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً قربانی کرنا، ایسے افعال بجالانا جو نماز سے متعلق ہوں جیسے تحویل قبلہ وغیرہ، رفع یدین کرنا، سینے پر ہاتھ رکھنا، دوسجدوں کے درمیان اس طرح بیٹھنا کہ سینہ ظاہر ہو جائے اور دعا سے پہلے اپنے ہاتھ سینے تک اٹھانا(۴۳)۔

اگرچہ مناسباتِ قرآن اور دیگر شواہد سے واضح ہے کہ یہاں نحر سے مراد قربانی کرنا ہی ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے اسی مقام پر توضیح فرمائی لیکن اگر کوئی اس مقام پر کسی اور دلیل کی بنا پر کہے کہ اس کا معنیٰ قربانی کرنا نہیں بلکہ دوسجدوں کے درمیان بیٹھنا یا دعا سے پہلے ہاتھ بلند کرنا ہے۔ دیگر مباحث اپنی جگہ لیکن اس کی یہ تاویل اس لحاظ سے بہرحال درست ہوگی کہ اس نے اِسی لفظ کا ایک مرجوح معنیٰ مراد لیا ہے۔لیکن اگر وہ یہ کہے کہ یہاں نحر سے مراد ہے: دشمن کے گھر کو مسمار کرو۔تو یہ تاویل باطل ہوگی کیونکہ اس تاویل کا اس لفظ سے معنوی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ﴾ (۴۴)۔ (جب سورج لپیٹ دیا جائے گا)۔

"تکویر" کا معنیٰ ہے کسی چیز کو لپیٹنا، جیسے: "کوّر الشیء" کا معنیٰ ہے: اس نے کسی چیز کو گول لپیٹا، "کوّر العمامة" کا معنیٰ ہے: اس نے سر پر پگڑی لپیٹی، "کوّر المتاع": اس نے سامان کی گٹھڑی باندھ لی۔

"یکور الیل علی النهار" کا مطلب ہے کہ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

"کوّر الشیء إذا رثه وضم بعضه الی بعض" (۴۵)۔(کسی چیز کو لپیٹنا یا بعض کو بعض سے ملا دینا)۔

اس سے واضح ہو رہا ہے ﴿اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ﴾ سے مراد ہے: جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا۔ اس آیہ کریمہ کی تاویل کرتے ہوئے بہاء اللہ کہتے ہیں:

> "سورج، چاند، ستاروں اور آسمان اور زمین کے بارے میں یہ عبارات کنایات ہیں اور ان کے فقط لفظی معنی نہ لیے جائیں انبیاء کا خاص تعلق مادی چیزوں سے نہیں بلکہ روحانی چیزوں سے ہوتا ہے جسمانی روشنی سے نہیں بلکہ روحانی نوران کے مدنظر ہوتا ہے۔ یوم قیامت کے بارے میں جب وہ سورج کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی مراد صداقت یا راست بازی کے سورج سے ہوتی ہے۔ سورج روشنی کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔ پس حضرت موسیٰ(علیہ السلام) یہودیوں کے آفتاب تھے۔ حضرت عیسیٰ(علیہ السلام) عیسائیوں کے اور حضرت محمدﷺ مسلمانوں کے جب انبیاء(علیہم السلام) سورج کے تاریک ہونے کا ذکر کرتے

ہیں ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آفتاب ہائے روحانی کی خالص تعلیمات غلط معانی اور سوءفہم اور تعصبات سے ایسی تاریک ہوگئیں ہیں کہ لوگ روحانی ظلمت میں سرگرداں ہیں'' (۴۶)۔

چونکہ ان الفاظ کا یہ مرجوح معنی بھی نہیں ہے اس لیے یہ تاویل فاسد اور لادینیت ہے اگر اسی ڈگر پر چلا جائے تو کوئی کسوٹی اور معیار نہیں رہے گا۔ جس کے جی میں جو آئے گا کہتا رہے گا اور دین بازیچہ اطفال بن جائے گا۔

تاویل قرآن مجید کے خلاف نہ ہو

ایسی تاویل بھی فاسد اور ناقابل قبول ہوگی جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔ خلاف قرآن ہونے کی درج ذیل بنیادی صورتیں ہیں:

۱۔ صراحتِ قرآنی کے خلاف ہو۔
۲۔ مناسباتِ قرآن کے خلاف ہو۔
۳۔ مقصدِ قرآن کے خلاف ہو۔
۴۔ سنت کے خلاف ہو۔
۵۔ تواتر یا اجماع امت کے خلاف نہ ہو۔

ان کی کچھ وضاحت ملاحظہ ہو:

۱۔ صراحتِ قرآنی کے خلاف نہ ہو

کسی آیت کی ایسی تاویل کرنا جو اس وضاحت کے خلاف ہو جو قرآن مجید میں ہی دوسرے مقام پر کر دی گئی ہو یا ایسی تاویل جو نصوص قرآنی کے خلاف ہو، ناقابل قبول ہوگی مثلاً: ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾ (۴۷)۔

(اور اپنا عصا پھینک دیجئے پھر جب آپ نے اسے دیکھا تو وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا تھا)۔

اس مقام پر تشبیہ کو دلیل بنا کر یہ تاویل کرنا کہ آپ کی لاٹھی سانپ نہیں بنی تھی جیسا کہ سرسید احمد خانؒ لکھتے ہیں:

''ان آیتوں پر، جو عصائے موسیٰ (علیہ السلام) کے سانپ بننے اور ید بیضا پر دلالت کرتی ہیں، غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر طاری ہوئی اسی قوت نفس کا انسانی ظہور تھا۔ جس کا اثر خود ان پر ہوا تھا یہ کوئی معجزہ یا فوق الفطرت نہ

تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ
یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے
ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) میں از روئے فطرت و
جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں انہوں نے
اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ ان کو سانپ یا اژدھا
دکھائی دی۔ یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا۔ وہ لکڑی لکڑی ہی تھی۔ اس میں فی
الواقع کچھ تبدیلی نہیں تھی خدا نے اس جگہ یہ نہیں فرمایا "فانقلبت العصا ثعبانا" یعنی وہ
لاٹھی بدل کر سانپ ہوگئی بلکہ سورہ نمل میں فرمایا: ﴿کَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾ گویا وہ اژدھا تھا۔ اس
سے ظاہر ہے کہ وہ درحقیقت اژدھا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ لاٹھی تھی" (۴۸)۔

یہ تاویل اس لیے باطل ہے کہ وہ قرآن مجید کی نصوص اور تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ایک
اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ﴾(۴۹)۔

(پس انہوں نے اپنا عصا ڈال دیا۔ تو وہ اسی وقت صاف اژدہا بن گیا)۔

اس میں وضاحت ہے کہ لاٹھی سانپ بن گئی تھی ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۞ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا
الْاُوْلٰى﴾(۵۰)۔

(انہوں نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اچانک بھاگتا ہوا سانپ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ
اسے پکڑ لو اور ڈرو مت ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے)۔

ان آیات طیبات میں اس تاویل فاسد کے خلاف دو صراحتیں بالکل واضح ہیں۔ ایک تو واضح الفاظ میں
فرمایا گیا کہ وہ سانپ بن کر بھاگنے لگا اور دوسری بات یہ فرمائی کہ ہم پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ اگر لاٹھی لاٹھی
ہی تھی۔ تو اسے پہلی حالت پر لوٹانے کا کیا مقصد ہے؟ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لاٹھی سانپ بن گئی تھی تو
حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فرمایا گیا کہ ہم اسے دوبارہ لاٹھی بنا دیں گے۔ قرآن مجید کی ان تصریحات کے
سبب یہ تاویل باطل اور قرآنی تعلیمات کے خلاف ہوگی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں "کانھا جان" (گویا کہ وہ سانپ تھی) کا کیا مطلب ہے؟ تو
اس مقام پر مفسرین کرام نے متعدد توجیہات کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ "ثعبان" اژدہے یا بہت
بڑے سانپ کو کہا جاتا ہے اور "جان" چھوٹے اور پتلے سانپ کو کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر تشبیہ سے مراد یہ ہے

کہ وہ تھا تو ثعبان لیکن اس میں پھرتی اور تیزی اس بلا کی کہ گویا وہ جان یعنی پتلا اور پھرتیلا سانپ ہے یعنی تشبیہ پھرتی اور تیزی میں ہے لکڑی یا سانپ میں نہیں ہے۔

علامہ شوکانی اس مقام پر لکھتے ہیں:

''تتحرک کما یتحرک الجان، هو الحیة البیضاء، شبهها بالجان فی خفة حرکتها'' (۵۱)۔

(وہ (اژدہا) اس طرح حرکت کرتا تھا جیسے پھرتیلا سانپ حرکت کرتا ہے۔ یہاں جانّ سے تشبیہ حرکت کی تیزی کی وجہ سے ہے)۔

اسی طرح قرآن مجید میں ابلیس کا ذکر ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اس سے مراد شیطان ہے جس نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب یہاں ابلیس کی یہ تاویل کرنا کہ: ''انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے لیے ہی ہونا چاہیے۔ ابلیس کہلاتا ہے'' (۵۲)۔

ابلیس کے تشخص اور اس کے الگ وجود کا انکار کر کے اسے انفرادی عقل کا کوئی تقاضا ہی قرار دینا اس لیے تاویل فاسد اور گمراہی ہوگا کہ قرآن مجید کی نصوص اور تصریحات کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک مقام پر صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا:

﴿قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا﴾ (۵۳)۔

(فرمایا نکل جا یہاں سے، ذلیل مردود)۔

اگر شیطان کا الگ وجود ہی نہیں تھا تو یہ خطاب کس سے کیا گیا؟ یہ خطاب اس امر پر شاہد ہے کہ ابلیس کا ایک الگ وجود ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ (۵۴)۔

(اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا وہ جنوں میں سے تھا)۔

اس مقام پر صراحت فرما دی گئی کہ ابلیس جنوں میں سے تھا۔ قرآن مجید کی اس صراحت کے بعد یہ کہنا کہ ابلیس انسان کی ہی کسی خواہش کا نام ہے تاویل فاسد اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

الغرض ہر ایسی تاویل جو قرآنی صراحت کے خلاف ہو باطل ہوگی۔

۲۔ تاویل مناسبات قرآنی کے خلاف نہ ہو

کسی آیت کی ایسی تاویل کرنا جو مناسبات قرآنی کے خلاف ہو۔یعنی کلام کا سیاق وسباق جس تاویل کے منافی ہو وہ تاویل بھی فاسد کہلائے گی جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ﴾(۵۵)۔

(جب یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! میں نے گیارہ ستاروں، سورج اور چاند کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے)۔

یہ آیہ کریمہ سورۃ یوسف کی ہے۔جس میں یوسف (علیہ السلام) کے اس خواب کا تذکرہ ہے جو انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے سامنے بیان کیا تھا۔اس کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔جس سے واضح ہے کہ جس یوسف (علیہ السلام) نے خواب دیکھا اسی یوسف (علیہ السلام) کو کنوئیں میں پھینکا گیا۔وہی مصر کے بازار میں بکے، انہیں کے ساتھ زلیخا کا معاملہ پیش آیا، وہی ملک مصر کے تخت پر بیٹھے اور انہی کے پاس ان کا خاندان پہنچا اور ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا تو اس مقام پر اس آیت کی یہ تاویل کرنا خلاف قرآن ہے:

وقد قصد الرحمن من ذكر يوسف نفس الرسول و ثمره البتول حسين ابن ابى طالب...... اذ قال حسين لأبيه يوما انى رأيت احد عشر كوكبا والشمس و القمر رأيتهم...... سجادا...... ان الله قد اراد بالشمس فاطمة و بالقمر محمدا و بالنجوم أئمة الحق فى أم الكتاب معروفا فهم الذين يبكون على يوسف بأذن الله سجدا وقياما (۵۶)۔

(حضرت یوسف (علیہ السلام) کے ذکر سے اللہ تعالیٰ نے ذات رسول ﷺ اور ثمرہ بتول، حضرت حسین ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ مراد لیے ہیں جب ایک دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے کہا کہ میں نے گیارہ ستارے، سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ کی مراد سورج سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، چاند سے حضرت محمد ﷺ اور ستاروں سے آئمہ حق ہیں، جو ام الکتاب میں معروف ہیں اور وہی ہیں جو سجدوں اور قیام میں اس یوسف پر روتے رہے)۔

یہ تاویل، تاویل فاسد اور گمراہی ہے کیونکہ یہ مناسباتِ قرآنی کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی خلاف قرآن ہے۔

۳۔ مقصد قرآن کے خلاف نہ ہو

کسی بھی مقام پر قرآن کریم کی ایسی تاویل کرنا، جو اس مقصد اور مدعا کے خلاف ہو جس کے لیے ان آیات کو نازل کیا گیا ہے، بھی تاویل فاسد کہلائے گی۔ تاویل کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے کہ وہ مقصدِ قرآنی کے خلاف نہ ہو مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾(۵۷)۔

(اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ کر تمہیں نجات دی اور قوم فرعون کو تمہارے سامنے غرق کر دیا)۔

اس آیہ کریمہ کو نازل ہی اس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات یاد دلائے جائیں جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر ان پر فرمائے تھے تاکہ ان میں قبولیت حق کا جذبہ پیدا ہو کیونکہ احساسِ نعمت منعم کی یاد دلاتا ہے۔ یہ پورا رکوع ہی بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد دلانے کے لیے نازل کیا گیا اور ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ تمہارے لیے سمندر میں راستے بنا دیئے، تمہیں بچا لیا اور تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعون اور اس کے پیروکاروں کو غرق کر دیا۔ اب اس آیہ کریمہ کی کوئی ایسی تاویل کرنا جس کی وجہ سے یہ عظیم احسان اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل نہ رہے اور ایک معمول کی چیز بن کے رہ جائے تاویل فاسد ہوگی۔ اس آیت کی تاویل کرتے ہوئے یہ کہنا باطل ہوگا کہ:

''نہ کوئی دریا پھٹا اور نہ کوئی خلاف عادت معجزہ ظہور میں آیا تھا بلکہ اس دریا کی سمندر کی طرح عادت تھی کہ مدو جزر چڑھنا اترنا آناً فاناً اس میں ہوا کرتا تھا۔ پس جب رات کو موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل سمیت گزرے تھے اس وقت خشک تھا اور جب فرعون گزرنے لگا تو اتفاقاً چڑھ گیا''(۵۸)۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ کوئی معمول کا ایک معاملہ ہی تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بنی اسرائیل پر اپنا خصوصی انعام کیوں قرار دیا؟ اسی طرح بنی اسرائیل پر اپنے خصوصی انعامات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۵۹)۔

(اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا۔ تو ہم نے کہا اپنی لاٹھی پتھر پر ماریئے۔ تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے)۔

یہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کی پیاس بجھانے کا انتظام

کیا۔ اس آیت کریمہ کی یہ تاویل کرنا کہ:

> ”حجر کے معنی پہاڑ کے ہیں اور ضرب کے معنی رفتن کے پس صاف معنی یہ ہوئے کہ اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چل۔ اس پہاڑ کے پرے ایک مقام ہے۔ جہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے۔ خدا نے فرمایا: ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ یعنی اس میں سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے“(٦٩)۔

اس تاویل کا لفظ لفظ تصنع اور تکلف پر دلالت کر رہا ہے۔ پانی کا چشمہ تو کیا ایک گھونٹ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن بنی اسرائیل پر اپنے خصوصی احسانات کے تذکرہ میں لاٹھی مارنے سے پتھر سے بارہ چشمے نکلنے کا ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کے کسی خصوصی احسان کی طرف اشارہ کر رہا ہے تاکہ اسے یاد کر کے ان کے دل اللہ کی طرف مائل ہوں۔ اسے اس سے نیچے گرا کے ایک معمول کی چیز بنا دینا مقصد قرآنی کے خلاف ہے اور یہ تاویلِ فاسد کی علامات میں سے ہے۔

الغرض تاویل کی صحت کے لیے شرط ہے کہ وہ کسی بھی پہلو سے قرآن مجید کے خلاف نہ ہو۔

۴- سنت کے خلاف نہ ہو

تاویل کی تعریف میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ تاویل نبی کریم ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کی بیان فرمودہ توضیح کے خلاف نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کی تبیین نبی کریم ﷺ کا منصب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾(٦١)۔
>
> (اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس کتاب کی توضیح کر دیں جو آپ پر نازل کی گئی، شاید وہ غور وفکر کریں)۔

جس طرح قرآن مجید لوگوں کو سنانا منصبِ رسالت ہے اسی طرح قرآن مجید کی تعلیم دینا بھی نبی کریم ﷺ کا منصب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾(٦٢)۔
>
> (وہ وہی ہے جس نے امیوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ انہیں پاک کرتے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور اس سے پہلے وہ (لوگ) بڑی واضح گمراہی میں تھے)۔

کتاب کی تعلیم دینے سے مراد قرآن کریم کی آیات کی توضیح اور ان آیات سے مرادِ الٰہی کو واضح کرنا ہے۔
مثلاً: لغت میں صلوٰۃ کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا تو حضور اکرم ﷺ نے نماز پڑھ کے فرمایا: جس طرح میں نے نماز پڑھی ایسے ہی تم نماز پڑھو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم ﴿اقیموا الصلوٰۃ﴾ سے یہی مراد ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ، حج، صوم وغیرہ کے لغت میں متعدد معانی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے توضیح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی ان سے کیا مراد ہے اور پھر ان کی تفصیلات کو بیان فرمایا۔ جس طرح قرآن مجید کے الفاظ پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اس کے ان مطالب اور معانی پر بھی ایمان لانا ضروری ہے جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں اس لیے قرآن مجید کی تعریف میں وضاحت کی گئی ہے۔

"اسم للنظم و المعنی جمیعا" (۶۳)۔

(قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے)۔

اس لیے قرآن مجید کی کوئی بھی ایسی تاویل کرنا جو سنت نبوی کے خلاف ہو تاویل فاسد اور گمراہی ہوگی۔
اس لیے باطنیہ کی یہ تاویلات کہ وضو سے مراد امام کی پیروی ہے اور تیمم سے مراد امام کی عدم موجودگی میں اس کے جانشین سے استفادہ کرنا، صلوٰۃ سے مراد ذات رسول کریم ﷺ، جنت سے مراد آرام پانا، جہنم سے مراد مشقت اٹھانا، ملائکہ سے مراد باطنیہ کے داعی اور شیاطین سے مراد ان کے مخالفین وغیرھم (۶۴)۔

یہ سب تاویلات فاسد اور گمراہی ہیں کیونکہ یہ سنت اور توضیحات نبوی کے خلاف ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (۶۵)۔

(حضرت محمد ﷺ تم میں سے کسی بھی مرد کے باپ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور آخری نبی ہیں)۔

یہاں خاتم النبیین کی کوئی ایسی تاویل کرنا، جس سے حضور اکرم ﷺ آخری نبی نہ رہیں، باطل ہوگا اور ایسی تاویل تاویلِ فاسد ہوگی یہ کہنا کہ:

"خاتم النبیین کے بارے میں حضرت مسیح موعود نے فرمایا کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مہر کے بغیر کسی کی نبوت کی تصدیق نہیں ہوسکتی جب مہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کی مہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے (۶۶)۔

اس تاویل سے واضح ہو رہا ہے کہ مؤوّل کے نزدیک حضور اکرم ﷺ آخری نبی نہیں ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ نبیوں کی مہر ہیں یعنی آپ ﷺ جس پر مہر لگائیں وہی نبی بنتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ خاتم النبیین سے مراد افضل

النبیین ہے اور یہاں پر خاتم کی تاویل افضل سے کرنا اور یہ کہنا کہ:

''اہل عرب اور دوسرے محققین علماء کے نزدیک جب بھی کسی ممدوح کو خاتم الشعراء یا خاتم الفقہاء یا خاتم المحدثین یا خاتم المفسرین کہا جاتا ہے تو اس کے معنی بہترین شاعر، سب سے بڑا فقیہ، سب سے بلند مرتبہ محدث یا مفسر کے ہوتے ہیں'' (٦٧)۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خاتم کا لفظ مجازی طور پر کبھی کبھی افضل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس آیت میں اس کی تاویل افضل النبیین کر کے آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کا انکار کرنا اس لیے تاویل فاسد اور لادینیت ہے کہ یہ تاویل ان توضیحات کے خلاف ہے جو اس تناظر میں خود حضور اکرم ﷺ نے فرمائی ہیں۔

سنت نبوی سے واضح ہے کہ یہاں خاتم النبیین سے مراد آخری نبی ہی ہیں۔ صرف دو شواہد ملاحظہ ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفه نبی وانه لا نبی بعدی و سیکون خلفاء'' (٦٨)۔

(بنی اسرائیل کی قیادت ان کے انبیاء کرام کرتے تھے جب ایک نبی کا وصال ہو جاتا تو دوسرا نبی ان کا جانشین ہو جاتا اور یقیناً میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور عنقریب خلفاء ہوں گے)۔

یہ حدیث مبارک خاتم النبیین کی تفصیل ہے اگر وہاں خاتم کا معنی کوئی اور ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس مفہوم کو اس طرح بیان نہ فرماتے۔ آپ یہ نہ فرماتے کہ میرے بعد نبی نہیں ہوگا البتہ خلفاء ہوں گے پھر تو روایت کے الفاظ یوں ہونا چاہیے تھے کہ بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کرتے تھے اور میرے بعد کوئی اعلیٰ اور افضل ہی تو نہیں ہوگا البتہ ظلی یا بروزی ہو سکتے ہیں یا میرے بعد وہی نبی ہوگا جس پر میری مہر ہوگی۔ العیاذ باللہ۔

اور یہاں خلفاء کا تذکرہ بالکل بے معنی اور غیر متعلق ہوتا کیونکہ جب نبی ہی آئیں گے تو خلفاء کا کیا مطلب؟ لیکن حضور ﷺ نے اپنے بعد مطلق نبوت کی نفی فرمائی اور خلفاء کا ذکر فرمایا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور قیادت خلفاء سرانجام دیں گے حضور اکرم ﷺ کا یہ واضح فرمان خاتم النبیین کی تفسیر ہے کہ یہاں اس سے مراد آخری نبی ہے۔

۵۔ تواتر یا اجماع امت کے خلاف نہ ہو

تاویل کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ وہ تواتر یا اجماع امت کے خلاف نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک کثیر المعنی لفظ کا وہی معنی متعین کیا جائے گا جو مسلمات کے مطابق ہوگا اور مسلمات کو ایک کثیر

المعنی لفظ کے مرجوح معنی کی بھینٹ چڑھانا ہر لحاظ سے غلط اور نا قابل قبول ہوگا مثلاً: صلوٰۃ کے کئی معانی ہیں۔ جن میں سے ایک معنی دعا مانگنا بھی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ﴿اقیموا الصلوٰۃ﴾ میں ''الصلوٰۃ'' سے مراد ''نماز'' نہیں بلکہ صرف دعا مانگنا لے لے اور وہ دعا مانگ کے یہ سمجھے کہ میں نے حکم صلوٰۃ پر عمل کر لیا تو اس کا یہ دعویٰ اس لیے بھی باطل ہوگا کہ اس کی یہ تاویل امت کے تواتر اور اجماع کے خلاف ہے اور اس کا یہ عمل مومنین کے راستے سے ہٹ کر ایک الگ راستے پر چلنا ہے ایسے ہی شخص کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔ ارشا د باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَت مَصِیۡرًا﴾(۶۹)۔

(اور جو اس راستے پر چلتا ہے جو مومنین کا راستہ نہیں ہے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کر دیں گے جدھر وہ کرنا چاہے گا اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

تواتر کے خلاف کی گئی ہر تاویل، تاویلِ فاسد اور لادینیت ہوگی مثلاً: قرآن مجید کی نصوص سے واضح ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو انسان اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور حساب کتاب کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ O وَاِذَا الۡكَوَاكِبُ انۡتَثَرَتۡ O وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ O وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ O عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ﴾(۷۰)۔

(جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر بہائے جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا)۔

ان آیات کی تفسیر میں شروع دن سے آج تک امت اس بات پر متفق ہے کہ یہاں وقوع قیامت کے احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ شروع دن سے آج تک مفسرین کرام کی تفاسیر اس پر شاہد ہیں۔ اس تواتر کے خلاف اس کی تاویل کرتے ہوئے یہ کہنا کہ۔

''کہ سورج، چاند، ستاروں اور آسمانوں اور زمین کے بارے میں یہ عبارات کنایات ہیں اور ان کے فقط لفظی معنی نہ لیے جائیں...... یوم قیامت کے بارے میں جب وہ سورج کا ذکر فرماتے تھے تو

ان کی مراد صداقت یا راستبازی کے سورج سے ہوتی تھی...... جب انبیاء سورج کے تاریک ہونے کا ذکر کرتے تھے تو ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ آفتاب ہائے روحانی کی خالص تعلیمات غلط معانی اور سوءِ فہم اور تعصبات سے ایسی تاریک ہوگئی ہیں کہ لوگ روحانی ظلمت میں سرگرداں ہیں...... جب یہ کہا گیا ہے کہ چاند روشنی نہ دے گا یا لہو بن جائے اور ستارے آسمان سے گر پڑیں گے تو اس سے مراد یہ ہے کہ علماء اور رؤسا دین اپنے مقام سے گر کر جنگ و فساد میں مشغول ہو گئے۔ دنیا دار بن کر آسمانی چیزوں کی بجائے دنیوی چیزوں سے زیادہ دل لگائیں گے"(۷۱)۔

یہ تاویل، تاویل فاسد اور لادینیت ہوگی کیونکہ یہ امت کے تواتر کے خلاف ہے۔

نتائج بحث

اس بحث کے نتائج میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

۱۔ تاویل کا لفظی معنی لوٹنا یا رجوع کرنا ہے قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۲۔ متقدمین تاویل اور تفسیر کو مترادف کے طور پر استعمال کرتے تھے اور ایک قول یہ تھا کہ تفسیر کا تعلق روایت سے ہے اور تاویل کا درایت سے۔

۳۔ متاخرین کے نزدیک یہ لفظ ایک خصوصی مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔

۴۔ ان کے نزدیک علم تفسیر میں تاویل کا مرکزی مطلب ،جس نے اس لفظ کو بحث وتمحیص کا محور بنایا، یہ ہے کہ کسی مانع کی وجہ سے کسی لفظ کا راجح معنی ترک کر کے اس کا مرجوح معنی مراد لیا جائے۔

۵۔ علم تفسیر میں تاویل کی اہمیت وضرورت کا انکار ناممکن ہے۔

۶۔ تاویل کرنے کے لیے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے ورنہ وہ تاویل، تاویل فاسد اور گمراہی ہوگی۔

۷۔ تاویل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں لفظ کا حقیقی معنی مراد نہ لینے پر کوئی قوی دلیل موجود ہو۔

۸۔ جس معنی سے اس کی تاویل کی جائے وہ بھی اسی لفظ کا مرجوح معنیٰ ہو۔

۹۔ تاویل کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید، مناسبات و مقاصدِ قرآنی، سنت نبوی، تواتر معنوی اور اجماع امت کے خلاف نہ ہو۔

حوالہ جات

۱- مفردات الفاظ القرآن، العلامہ الراغب الاصفہانی، مادہ الاول، دار الکاتب العربی۔

۲- البرہان فی علوم القرآن، ۲/۱۴۸، امام محمد بن عبد اللہ الزرکشی، المکتبۃ العصریۃ، بیروت۔

۳- التفسیر والمفسرون، ۱/۱۹، الدکتور محمد حسین الذہبی، دار الحدیث، القاہرہ۔

۴- سورۃ یوسف۱۲: ۱۰۰۔

۵- سورۃ یوسف۱۲: ۴۴۔

۶- سورۃ النساء۴: ۵۹۔

۸- سورۃ بنی اسرائیل۱۷: ۳۵۔

۹- سورۃ الاعراف ۷: ۵۳۔

۱۰- سورۃ یونس۱۰: ۳۹۔

۱۱- سورۃ الکہف۱۸: ۷۸۔

۱۲- سورۃ بنی اسرائیل۱۷: ۸۳۔

۱۳- سورۃ آل عمران۳: ۷۔

۱۴- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، التفسیر والمفسرون، ۱/۲۰-۲۱۔

۱۵- الاتقان فی علوم القرآن، ۴/۴۶۰، امام جلال الدین سیوطی، دار الفجر للتراث۔

۱۶- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، التفسیر والمفسرون، ۱/۲۲۔

۱۷- ایضاً، ۱/۲۱۔

۱۸- الترغیب والترہیب، ص۵۶۴، الامام عبد القوی المنذری، دار ابن حزم، بیروت، رقم الحدیث، ۴۴۲۱۔

۱۹- سورۃ بنی اسرائیل۱۷: ۷۲۔

۲۰- سورۃ طٰہٰ۲۰: ۱۲۴-۱۲۶۔

۲۱- تفسیر القرآن العظیم، ۳/۵۲، الامام ابن کثیر الدمشقی، دار الحدیث، القاہرہ۔

۲۲- التفسیر الکبیر، ۷/۱۸۹، امام فخر الدین رازی، مکتب الاعلام الاسلامی۔

۲۳- الاتقان، ۴/۴۶۰۔

۲۴- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، البرہان فی علوم القرآن، ۲/۱۵۰۔

۲۶- کتاب التعریفات، ص۳۲، السید الشریف علی بن محمد الجرجانی المطبعۃ الخیریۃ، مصر (۱۳۰۶ھ)۔

۲۷- التفسیر والمفسرون، ۱/۲۰۔

۲۸- سورۃ الاعراف ۷: ۵۴۔

۲۹- ضیاء القرآن، ۱/۲۷، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور۔
۳۰- التفسیر الکبیر، ۱۸۹/۶۔
۳۱- سورۃ آل عمران ۳: ۴۹۔
۳۲- التفسیر الکبیر، ۶۰/۷۔
۳۳- تفسیر القرآن، ۲۴۶/۱، سرسید احمد خان، کشمیری بازار، لاہور۔
۳۴- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سنن ابی داؤد، ۲/ ۲۳۸، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال، ایچ۔ ایم، سعید کمپنی، کراچی۔
۳۵- حقیقۃ الوحی، ص ۳۰۷، مرزا غلام احمد قادیانی، مطبوعہ قادیان (۱۹۰۷ء)۔
۳۶- ضرب کلیم، ص ۶۱، علامہ محمد اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔
۳۷- جامع ترمذی، ۶۴/۲، ابواب الفتن، سعید کمپنی، کراچی۔
۳۸- مفردات الفاظ القرآن، مادہ نزل (ص ۵۰۹)۔
۳۹- توضیح المرام، ص ۳، مرزا غلام احمد قادیانی، نظارت اشاعت، ربوہ۔
۴۰- سورۃ قریش ۱۰۶: ۳۔
۴۱- التفسیر والمفسرون، ۲۱۶/۲۔
۴۲- سورۃ الکوثر ۱۰۸: ۲۔
۴۳- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: التفسیر الکبیر، ۱۲۸/۳۲۔
۴۴- سورۃ التکویر ۸۱: ۱۔
۴۵- مفردات الفاظ القرآن، مادہ کوّر (ص ۴۶۰)۔
۴۶- بہاء اللہ وعصر جدید، ص ۲۷۴، جے۔ای۔ ایسلمنٹ، بہائی پبلشنگ ٹرسٹ، ۱۷۷-ای، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی۔
۴۷- سورۃ النمل ۲۷: ۱۰۔
۴۸- تفسیر القرآن، ۲۲۲/۳۔
۴۹- سورۃ الاعراف ۷: ۱۰۸۔
۵۰- سورۃ طٰہٰ ۲۰: ۲۰-۲۱۔
۵۱- زبدۃ التفسیر، ص ۴۸۵، امام شوکانی، وزارۃ الاوقاف، الکویت۔
۵۲- ابلیس و آدم، ص ۵۳، غلام احمد پرویز، ادارہ طلوع الاسلام، لاہور۔
۵۳- سورۃ الاعراف ۷: ۱۸۔
۵۴- سورۃ الکہف ۱۸: ۵۰۔
۵۵- سورۃ یوسف ۱۲: ۴۔
۵۶- مفتاح باب الابواب، ص ۳۰۹، مرزا محمد مہدی خان، بحوالہ التفسیر والمفسرون، ۲/۲۳۲۔

۵۷- سورۃ البقرہ۲:۵۰۔

۵۸- تفسیر القرآن، ۱/۹۹۔

۵۹- سورۃ البقرہ۲:۶۰۔

۶۰- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر القرآن، ۱/۱۱۳۔

۶۱- سورۃ النحل۱۶:۴۴۔

۶۲- سورۃ الجمعہ۶۲:۲۔

۶۳- نور الانوار، ص ۹، ملاجیون انبیٹھوی، سعید کمپنی، کراچی۔

۶۴- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: التفسیر والمفسرون، ۲/۲۱۔

۶۵- سورۃ الاحزاب۳۳:۴۰۔

۶۶- ملفوظات احمدیہ، ۵/۲۹۰۔

۶۷- القوال المبین فی تفسیر خاتم النبیین، ص ۱۸۰، مولانا ابو العطاء جالندھری مکتبہ الفرقان، ربوہ۔

۶۸- صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، رقم الحدیث، ۶۷۲۔

۶۹- سورۃ النساء۴:۱۱۵۔

۷۰- سورۃ الانفطار۸۲:۱-۵۔

۷۱- بہاء اللہ وعصر جدید، ص ۲۷۴۔